© rasailojaraid.com

غلام ربانی عزیز کیمبل پور

ازمنۂ وسطیٰ میں نظامِ سلطنت کا نقشہ

ازمنۂ وسطیٰ میں سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین ایشیا کے بہت بڑے حصّے پر قابض تھے۔ اوّل الذکر سلسلے کا بانی طغرل بیگ تھا جس نے ۴۲۹ھ (۱۰۳۷ء) میں اس خاندان کی بنیاد رکھی۔ ان سلاطین کی تعداد آٹھ تھی، جن میں الپ ارسلان اور ملک شاہ زیادہ مشہور تھے۔ ثانی الذکر خاندان شاہی کا بانی انوشتگین تھا۔ اس کے سلاطین کی تعداد بھی آٹھ تھی جن میں علاء الدین اور جلال الدین نے خاص شہرت حاصل کی۔ سلاجقہ کو خوارزم شاہیوں نے ختم کیا اور تاتاری مغلوں نے خوارزم شاہیوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ خوارزم شاہیوں کا عہدِ حکومت ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) سے ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) تک ہے۔ گویا مجموعی طور پر یہ خاندان دو سو برس تک ماوراء النہر، خراسان اور افغانستان پر حکمران رہے۔ سلجوقیوں کے عہد کو مورخین نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ سے تعبیر کیا ہے۔ خوارزم شاہی خاندان اس لحاظ سے "ممتاز" ہے کہ سلطان محمد کی غلط پالیسی سے ملک و ملت پر جو افتاد پڑی اس کی مثال بھی اور کہیں نہیں ملتی۔

مندرجہ ذیل سطور میں نظامِ حکومت کا وہ نقشہ پیش کیا گیا ہے جس پر اس زمانے میں عملدرآمد ہوتا تھا۔ یہ نقشہ نظام الملک کا تجویز کیا ہوا تھا، جو تمام ممالکِ محروسہ میں رائج تھا۔ خوارزم شاہی خاندان کا بانی، ملک شاہ سلجوقی کا طشت دار تھا۔ اس خدمت کے صلے میں اسے خوارزم کی حکومت ارزانی ہوئی تھی۔ اور سلطان تکش کے عہد تک یہ خاندان کم و بیش سلاجقہ کا باجگزار رہا تھا۔ اس لیے حکومت کے اصول و ضوابط یہاں بھی موجود تھے، جو سلجوقی قلمرو میں تھے۔

اس عہد کی انتظامی مشینری کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ انتظامیہ کا جو نقشہ آج اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس کا اُس زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ اس عملِ ارتقا کا نتیجہ ہے، جو انسانی سوسائٹی میں آدم سے لے کر اس وقت تک ہوتا چلا آیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہ کی ذات تمام اختیارات اور قوانین کا سرچشمہ شمار ہوتی۔ اگر حسنِ اتفاق سے بادشاہ خدا ترس اور رحم دل ہوتا، تو اتنے عرصے کے لیے رعایا کی حالت سدھر جاتی۔ ملک آباد ہو جاتا اور عوام خوشحال ہو جاتے۔ لیکن اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناخدا ترس اور خود سر ہوتا تو عوام کی حالت خراب ہو جاتی اور ہر طرف اُلّو بولتے سنائی دیتے۔

ہر چند بادشاہ کی جانشینی کے بارے میں یہ اصول طے شدہ تھا کہ اس کا بڑا بیٹا باپ کے بعد اُمورِ سلطنت کا کفیل ہوگا لیکن جب اس قاعدہ کو عملی صورت دینے کا موقعہ آتا تو جس طرح سے اس کی مٹی پلید ہوتی وہ مقام صد ہزار عبرت ہے۔ بادشاہ کی زندگی ہی میں دربار کی سازشیں شروع ہو جاتیں اور امرا کی ذاتی رقابتیں کئی دعویٰ دارانِ سلطنت کو جنم دیتیں۔ بھائی بھائی کے خلاف صف آرا ہو جاتا۔ بھینسے لڑتے تو چھوٹے چھوٹے پودے پامال ہو کر رہ جاتے۔ طوائف الملوکی کا دَور دَورہ ہوتا۔ کئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں تعمیر ہو جاتیں۔ جب اس خانہ جنگی سے ملک تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا تو ہمسایہ طاقتوں میں سے کوئی من چلا فرماں روا حملہ آور ہو کر سب کو دبوچ لیتا۔ جب اس کو موت کا پیغام آتا تو یہی ڈراما پھر سے دہرایا جاتا۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح سے چلتا رہتا۔

ملک شاہ سلجوقی کے دو بیٹے تھے، برکیارق اور محمد۔ ملک شاہ کے مرنے کی دیر تھی کہ بھائیوں نے آپس میں جنگ شروع کر دی اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک محمد مارا نہ گیا۔ اسی طرح ایل ارسلان کے، جو خوارزم شاہی خاندان کا چوتھا حکمران تھا، دو بیٹے تھے۔ سلطان شاہ بڑا تھا اور تکش چھوٹا۔ باپ نے اپنی زندگی میں ہی سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ چونکہ سلطان شاہ بڑا تھا، اس لیے اُسے ولی عہد نامزد کر کے تکش کو وصیت کی کہ وہ بھائی کے ساتھ بگاڑ نہ کرے لیکن خوارزم شاہ کے مرتے ہی سلطان شاہ نے تمام قلمرو پر قبضہ کر کے تکش کو اس کے جائز حقوق سے محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں متواتر تیئیس سال تک اپنی بالادستی اور بحالی حقوق کے لیے لڑتے رہے۔ چنانچہ جب سلطان شاہ مر گیا تو اس کے بعد ہی سے تکش نے خود کو خوارزم شاہ کہلانا شروع کیا۔

اسی طرح سلطان محمد نے ترکان خاتون کے کہنے پر سلطان جلال الدین کو ولی عہدی سے محروم کر کے ازلاق سلطان کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ حالانکہ جلال الدین بڑا ہونے کے علاوہ بڑا بہادر اور دلیر سپاہی تھا۔ اگر ازلاق سلطان مغلوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو یقیناً سلطان جلال الدین کو بھائی کے خلاف بھی بارہا صف آرا ہونا پڑتا۔ بے یقینی کی یہ حالت ہر سلطنت کے استحکام کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی۔ عموماً ہر سربراہِ مملکت کی موت بدنظمی، افراتفری اور لوٹ مار کا پیغام لے کر آتی۔ بے وجہ خونریزی ہوتی، مفسد پرداز کو لوٹ مار اور قتل و غارت کا بہانہ مل جاتا۔ عوام میں بے اطمینانی پھیلتی۔ زراعت اور تجارت کو، جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوش حالی اور فارغ البالی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، سخت دھچکا لگتا۔

مسلمان سلاطین عام طور پر پابندِ مذہب ہوتے تھے۔ جہاں تک بن پڑتا، احکامِ خداوندی کی پابندی کا خیال رکھتے۔ لیکن چونکہ تاج و تخت ورثے میں ملتا تھا، اس لیے ہر چیز کو وہ اپنی ذاتی ملکیت شمار کرتے۔ دینے پر آتے تو لاکھوں بخش دیتے، گھوڑے، ہاتھی، زمینیں اور جاگیریں۔ مال و متاع کا ان کے یہاں کوئی حد و شمار نہ تھا۔ گویا لکھ بخش تھے کہ دھن لٹاتے پھرتے تھے لیکن جب کسی سے بگڑ جاتے تو لاکھوں میں کھیلنے والے دم بھر میں مفلس و قلاش بنا دیے جاتے۔ انعام و اکرام واپس اور تمام جائداد ضبط کر لی جاتی۔ چھوٹے اہل کار تو بعض اوقات اپنی کم مائیگی کی وجہ سے بچ بھی جاتے لیکن خطرہ کی تلوار ہر وقت اراکینِ سلطنت کے سر پر لٹکتی رہتی۔ اس پر طرّہ یہ کہ آپس کی رنجشیں اور درباری رقابتیں جلتی پر تیل کا کام دیتیں۔ ہر شخص دل سے دوسرے کا بدخواہ اور ہم عصروں کی رسوائی کا جویا رہتا۔ جب موقع ملتا، لگائی بجھائی سے نہ چوکتا۔ اور تو اور وزیرِ اعظم اور افواجِ شاہی کے سپہ سالار بھی خود کو محفوظ خیال نہ کرتے۔ چونکہ ہر آدمی دوسرے کو مات دینے کے لیے کوشاں رہتا، اس لیے بعض اوقات بڑی ہی ناقابلِ رشک حالت پیدا ہو جاتی۔ اتفاقاً کوئی بے گناہ سازشوں کے صدقے میں قتل کر دیا جاتا تو دشمن پھولے نہ سماتے کہ چلو میدان مار لیا۔ اب پانچوں گھی میں ہیں۔ لیکن جلدی ہی بھانڈا پھوٹ جاتا اور حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔ اب سازشیوں کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے۔ تلوار کی دھار یا رسوائی اور ناکامی کی زندگی۔ گویا از منۂ وسطیٰ کے دربار سازشوں اور رقابتوں کے رسوائے زمانہ اڈے تھے۔

اگرچہ اس عہد میں رفاہِ عامہ کا موجودہ تصور ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور سلاطین کو لڑنے جھگڑنے سے ہی بہت کم فرصت نصیب ہوتی تھی۔ تاہم ان سے کوئی نہ کوئی ایسا کام بھی ہو جاتا جسے اس ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مدرسے، شفاخانے، سرائیں، سڑکیں اُس زمانے میں بھی بنائی جاتی تھیں اور عوام اُن سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ سلاطین دل سے چاہتے کہ رعایا خوش حال رہے لیکن سرکاری اہل کار ہمیشہ کی طرح اس زمانے میں بھی رشوت خور ہوتے تھے۔ اور لوگوں کو اپنی مطلب برآری کے لیے انھیں خوش کرنا ہی پڑتا تھا۔

زراعت اور کھیتی باڑی اس زمانے کا سب سے بڑا ذریعہ معاش تھا۔ اور آبادی کے ایک معتدبہ حصّے کا گزارا اسی پر منحصر تھا۔ بارش ہوتی تو وارے نیارے ہو جاتے۔ مگر قحط کا خطرہ ہر وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سر پہ منڈلاتا رہتا۔ جہاں ممکن ہوتا، دریاؤں، ندی نالوں اور چشموں سے آب پاشی کی ضرورت پوری کرلی جاتی۔ نہروں اور کنوؤں کی کھدوائی کا کام حکومت کے تعاون بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔

سلطان کا حرم اور محافظ خانہ دو بڑے انتظامی شعبے شمار ہوتے تھے۔ بادشاہ کی حفاظت کے لیے ترک غلام بھرتی کیے جاتے، جو براہِ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتے اور ان کا اہم فرض بادشاہ اور اس کے متعلقین کی حفاظت ہوتا۔ فوجی خدمات مختلف صوبوں کے گورنر اور قبائل کے سردار انجام دیتے جب ضرورت پیش آتی، انھیں طلب کرلیا جاتا۔ اس عہد کی جنگیں مہینوں اور سالوں کا قصہ نہیں ہوتا۔ تھا، ایک آدھ دن میں ہی فیصلہ ہوجاتا۔ البتہ محاصرہ کا معاملہ مختلف نوعیت کا ہوتا۔ اکثر یہ قصہ مہینوں چلتا اور محصورین کو جانکاہ مصائب سے دوچار ہونا پڑتا۔

جنگوں کا فیصلہ اکثر بادشاہ کی ذاتی کارگزاری پر منحصر ہوتا۔ کیونکہ فوج بادشاہ کی ذاتی کمان میں لڑتی۔ جب تک بادشاہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا اور شاہی جھنڈا اس کے سر پر لہراتا رہتا۔ فوج جی توڑ کر لڑتی رہتی لیکن اگر کسی مجبوری سے بادشاہ کو پیچھے ہٹنا پڑتا، یا فوج کو احساس ہونے لگتا کہ بادشاہ حوصلہ ہار بیٹھا ہے تو پھر اس کے قدم اکھڑنے میں دیر نہ لگتی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کامیابی نے صرف ان لوگوں کے قدم چومے ہیں، جو میدانِ جنگ میں پہاڑ کی طرح ڈٹ کر کھڑے رہے۔

جب چنگیز خان نے سلطان محمد پہ حملہ کیا تو سلطان کی کمان میں تقریباً چار لاکھ آزمودہ کار سپاہ تھی لیکن چونکہ سلطان حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ اس لیے سلطان کی کمزوری اور بزدلی کا اثر سب میں سرایت کر گیا تھا۔ سوائے جلال الدین کے ہر شخص رعشہ بہ اندام تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ انھیں ہر مغل سپاہی موت کا فرشتہ دکھائی دیتا۔ سلطان کی وفات کے بعد جب جلال الدین نے عنانِ اختیار ہاتھ میں لی تو فوج کی حالت یک قلم بدل گئی۔ چنانچہ یہ اسی عالی حوصلگی کا نتیجہ تھا کہ سلطان نے کھوئی ہوئی سلطنت کا معتد بہ حصہ واپس لے لیا۔ وہ پورے دس برس تک نہایت کامیابی سے منگلوں جیسے خونخوار دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور اہلِ عالم نے دیکھ لیا کہ جب سلطان کی پامردی کا یہ بند حوادث کے ریلے کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گیا تو اہلِ عالم کو منگلوں کے ہاتھوں کیسے کیسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

ترک غلام جو بادشاہ کی ذاتی حفاظت کے لیے بھرتی کیے جاتے پہلے سال سائیس کہلاتے، جن کا کام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گھوڑوں کی دیکھ بھال تک محصور ہوتا۔ دوسرے سال انھیں گھوڑا مع ایک سادہ زین کے مل جاتا تیسرے سال ایک خاص کمربند دیا جاتا۔ چوتھے سال عمدہ زین اور مرصع لگام جس پر چاندی کے ستارے بنے ہوتے۔ پانچویں سال عمدہ لباس اور ایک ہنٹر۔ چھٹے برس وردی اور ساتویں برس وہ وثاق باشی کہلاتا۔ یعنی اسے چھوٹا سا خیمہ مل جاتا جس میں تین آدمی شریک ہوتے۔ اس منصب کا امتیازی نشان نمدے کی ایک ٹوپی ہوتی جس پر سونے اور چاندی کی تاروں سے کشیدہ کاری کا کام کیا ہوتا۔ یہ منصب دار آہستہ آہستہ خیل باشی اور حاجب کے درجے تک ترقی کر جاتے۔ شاہی محل کا تمام عملہ حاجب اعلیٰ کے ماتحت ہوتا جو بڑا بااثر سررشتہ دار شمار ہوتا تھا۔

اس کے بعد دوسرا افسر امیر حرس کا تھا، جو تمام ان لوگوں کی سزاؤں کے بارے میں جن کے مقدمات براہِ راست بادشاہ کے زیر سماعت ہوتے، ذمہ دار ہوتا۔ ان سزاؤں میں قتل کرنا، پھانسی دینا، ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور اسی نوعیت کی دوسری سزائیں شامل ہوتیں۔ ان منصب داروں کو اپنی ڈیوڑھی پر نوبت بجانے اور مکان پر شاہی جھنڈا لہرانے کی اجازت ہوتی۔ امیر کو اپنا رعب داب قائم رکھنے کے لیے پچاس مددگار سپاہی دیے جاتے، جن میں سے بیس کے پاس سنہری، بیس کے پاس روپہلی اور دس کے پاس لکڑی کے ہنٹر ہوتے۔

ان منصب داروں کے علاوہ شاہی درباروں میں چھوٹے موٹے اہل کاروں کا اچھا خاصا ہجوم ہوتا، جن میں دربان، دسترخوان لگانے والے، ساقی، محافظ، نوبت بجانے والے، آئینہ بردار اور طشت دار شامل تھے۔

اس عہد میں ابھی تک فوجی اور غیر فوجی، انتظامیہ اور عدالتی شعبوں میں حدِ فاصل قائم نہیں ہوئی تھی تمام محکمے ایک آدمی کی تحویل میں ہوتے، جو اکثر و بیشتر فوجی سردار ہوتا۔ شہزادے اور دوسرے قابلِ اعتماد افراد بھی جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوتے، ان مناصب پر سرفراز کیے جاتے خصوصاً ولی عہدِ سلطنت کو زیادہ اہم عہدوں پر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تاکہ اسے امورِ سلطنت کا تجربہ حاصل ہو جائے اور بوقتِ ضرورت تمام اختیار ہاتھ میں لے سکے۔ مثلاً الپ ارسلان نے شہزادہ تکش کو جند اور اس کے نواحی علاقوں پر حاکم مقرر کر رکھا تھا اور جب خوارزم شاہ کی وفات ہوئی تو شاہزادہ اسی سرحدی چھاؤنی کی حفاظت پر متعین تھا۔ اسی طرح جب تکش خوارزم شاہ ہوا تو اس نے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولی عہد شہزادہ ملک شاہ کو نیشاپور کی حکومت عطا کی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض ترک غلاموں کو ان کی خدمات کے عوض صوبوں کی گورنری عطا کر دی جاتی۔ چنانچہ خوارزم شاہی خاندان کا بانی بھی ایک ترک غلام تھا، جو اپنی حسنِ خدمات کے صلے میں اس منصبِ جلیل پر فائز ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ایسے مناصب پر پہنچنے کے لیے حدِ عمر پینتیس سال مقرر تھی۔ اس سے کم عمر کے آدمی کو ان اہم مناصب پر مقرر کرنے سے احتراز کیا جاتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خراسان کے صوبے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ صوبے کا صدر مقام نیشاپور تھا۔ چنانچہ اس امر کا خاص اہتمام کیا جاتا کہ اس صوبے کا گورنر قابلِ اعتماد اور نظم و نسق میں خاص مہارت رکھتا ہو۔

شاہی حرم کا انتظام جس امیر کے سپرد ہوتا، اسے وکیل کہتے تھے اس کے فرائض میں شاہی مطبخ اور شراب کی دیکھ بھال شامل تھی۔ اسی طرح شہزادوں کی مناسب تربیت اور ملازموں کی نگہداشت بھی اسی کے سپرد ہوتی۔ نیز شاہی اصطبل کا بندوبست بھی اسے ہی کرنا پڑتا۔

شاہی دربار کے اہم شعبے حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ دیوانِ وزارت، جس کا حاکمِ اعلیٰ وزیرِ اعظم کہلاتا۔

۲۔ دیوانِ مالیات۔ اس کے حاکمِ اعلیٰ کو مستوفی کہتے۔

۳۔ دیوانِ امورِ ریاست۔ اس محکمے کا افسرِ اعلیٰ عمید الملک کے لقب سے پکارا جاتا۔

۴۔ دیوانِ حفظہ۔ جو صاحب الشرطہ کی تحویل میں ہوتا۔

۵۔ دیوانِ مراسلات۔ اس کے حاکم کو صاحب البرید کہا جاتا تھا۔

۶۔ دیوانِ مشرف۔ اس کے افسرِ اعلیٰ کو مشرف کہتے۔

۷۔ دیوان خالصہ شریفہ۔ افسرِ اعلیٰ کو ناظم خالصہ کہتے تھے۔

۸۔ دیوانِ احتساب۔ افسرِ اعلیٰ کو محتسب کہتے تھے۔

۹۔ دیوانِ اوقاف کا حاکمِ اعلیٰ کا مہتمم اوقاف کہلاتا۔

۱۰۔ دیوانِ قضا کے حاکمِ اعلیٰ کو قاضی القضاۃ یا شیخ الاسلام کہتے تھے۔

وزیرِ اعظم جسے خواجہ بزرگ بھی کہتے تھے۔ نوکر شاہی نظام کا حاکمِ اعلیٰ شمار ہوتا۔ اس کا نشانِ امتیاز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قلمدان مقرر تھا۔ وزیر اعظم کا دیانت داری، راست بازی، دین داری اور اعتماد کی صفات سے متصف ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ سلطنت کی آبادی اور بادشاہ کی مقبولیت کا انحصار بہت حد تک وزیر اعظم کے برتاؤ پر ہوتا۔ اور وزیر کی ہر اچھی بات اور بری حرکت کا انتساب بادشاہ کی ذات سے کیا جاتا۔ اگر وزیر عوام کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا تو عوام کا لگاؤ بادشاہ سے بڑھتا۔ لیکن اگر وزیر انجام نا اندیش اور خود غرض ہوتا تو رعایا کے دلوں میں سربراہ مملکت کے خلاف جذبات نفرت و حقارت پیدا ہوتے رہتے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جس طرح بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا تخت کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض وزراء کے خاندانوں میں بھی کچھ عرصہ تک یہ روایت چلتی رہی۔ مثال کے طور پر برامکہ اور نظام الملک طوسی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

سلطان جلال الدین کا سوانح نگار احمد النسوی رقمطراز ہے کہ وزیر اعظم کو ملک کی تمام آمدنی کا دسواں حصہ بطور حق الخدمت ملتا تھا۔

وزیر کے بعد دوسرا درجہ مستوفی کا ہوتا۔ سلطنت کی تمام آمدنی اور خرچ کا حساب اس کی تحویل میں رہتا۔ نیز ضروری اخراجات کی مد میں اسے ہر وقت اتنی رقم موجود رکھنا پڑتی کہ بوقت ضرورت اسے فوری طور پر خرچ کیا جا سکے۔

دیوان الطغرا یا رسالت میں تمام شاہی فرامین اور احکامات محفوظ رکھے جاتے۔ اس دیوان کے حاکم اعلیٰ کو خواجہ عمید یا عمید الملک کہتے۔ تمام شاہی فرامین اسی دفتر سے جاری کیے جاتے اور ہر فرمان پر شاہی مہر ثبت کی جاتی۔ یہ مہر خواجہ عمید کی ذاتی تحویل میں ہوتی تاکہ کوئی شخص اس کا غلط استعمال نہ کرنے پائے۔ جس حکم پر شاہی مہر ثبت نہ ہوتی، اسے جعلی تصور کیا جاتا۔ نیز ہر حکم کی ایک نقل دفتر میں محفوظ رکھی جاتی۔

تمام افواج معہ ترک افواج کے جس افسر کے ماتحت ہوتیں، وہ حاکم افواج یا سپہ سالار کہلاتا۔ اس کے علاوہ ایک سول افسر بھی ہوتا، جسے عارض کہتے تھے۔ اس محکمے کی دیکھ بھال اسی افسر کے سپرد ہوتی۔ یہ براہ راست سپہ سالار یا اعظم کے ماتحت ہوتا اور فرائض کی بجا آوری میں اسی کے سامنے جوابدہ ہوتا۔ افواج کی تنخواہ کی ادائیگی اور ان کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد ہوتی۔ عہد حاضر کی طرح افواج کی بھرتی اور ان کو علیحدہ کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مرکز میں بادشاہ کی ذاتی فوج کے علاوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ اور کوئی فوج نہیں رکھی جاتی تھی۔ جب ضرورت پڑتی فوراً فوج بھرتی کر لی جاتی۔ یا صوبوں کے گورنروں کو لکھا جاتا اور فوج میدان میں پہنچنا شروع ہو جاتی۔ گورنروں کو فوجیں رکھنے کا اختیار تھا تاکہ اندرونِ ملک گڑبڑ نہ ہو اور دشمن طاقتیں حملہ آور نہ ہونے پائیں۔ جنگ کے موقع پر تمام افواج سلطان کی ذاتی کمان میں آجاتیں۔ اور چونکہ تمام اختیار اس کی ذات میں مرکوز ہوتے تھے اس لیے سپہ سالارِ اعظم ہونے کے علاوہ ملک کا چیف جسٹس بھی وہی شمار ہوتا تھا۔

دیوانِ مراسلات صرف شاہی احکام کی ترسیل کے لیے مخصوص ہوتا۔ مرکز کے احکام صوبوں تک پہنچانا اور ان پر عملدرآمد کا جائزہ لینا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ نیز تمام صوبوں میں آزادانہ طور پر اس کی شاخیں مصروفِ کار رہتیں اور مرکز کے ساتھ باقاعدہ تعلق قائم رکھتیں۔ نیز وہ شاہی احکام پر عوام اور خواص کے ردِعمل کی رپورٹ مرکز کو بھیجتی رہتیں تاکہ صوبوں کے گورنر راہِ راست سے بھٹکنے نہ پائیں اور مرکز کے سوا بدید کا خیال رکھیں۔

دیوانِ خالصہ شریفہ کا کام یہ تھا کہ بادشاہ کی غیر منقولہ جائداد کی دیکھ بھال کرے۔ کیونکہ شاہی محل کے تمام اخراجات انہی جاگیرات کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے اور اگر کوئی افسر اپنی زیرِ کفالت جاگیرات کے انصرام میں غفلت برتتا تو اسے سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا۔

دیوانِ احتساب کے حاکمِ اعلیٰ کو محتسب کہتے تھے۔ اس کے کارندے گلی کوچوں، منڈیوں اور بازاروں میں چکر کاٹتے رہتے تاکہ کوئی دکاندار کسی گاہک کو دھوکا نہ دینے پائے۔ نیز اشیائے خرید فروخت کے نرخوں کا تعین بھی یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ بعد میں عوام کے چال چلن کی نگہداشت بھی انہی کے سپرد کر دی گئی تھی۔ شراب پینے والے اور باقی نشہ آور اشیا کے استعمال کرنے والے ہمیشہ ان کے خوف سے رعشہ بر اندام رہتے۔

دیوانِ اوقاف کے اختیارات کا دائرہ تمام سرکاری اور نجی خیراتی اداروں پر حاوی تھا۔ چنانچہ سکولوں، کالجوں، شفاخانوں اور خانقاہوں کو اسی ادارے سے امداد ملتی تھی۔ نیز حکومت کی طرف سے بھی ہر سال ایک مقررہ رقم اس محکمے کو بطور سرکاری امداد عطا کرتی تاکہ رفاہِ عامہ کے کام فنڈ کی کمی کی وجہ سے رکنے نہ پائیں۔

عدلیہ کا حاکمِ اعلیٰ قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ تمام فوجداری اور دیوانی مقدمات کے لیے رعایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قاضیوں کی طرف رجوع کرتی اور فیصلہ اسلامی قوانین کے مطابق کیا جاتا۔ چونکہ تمام چھوٹے بڑے شہروں میں انفصالِ مقدمات کے لیے قاضی مقرر ہوتے، اس لیے اُن پر کڑی نظر رکھی جاتی تاکہ بے جا رواداری نہ ہونے پائے۔

مرکز کی طرح صوبوں میں بھی یہ تمام محکمے اور افسر پائے جاتے۔ صوبائی گورنر کے وزرا کو حاکم کہتے تھے جن کا تقرر خود بادشاہ کرتا۔ یا صوبوں کا گورنر جس کے لیے بعد میں بادشاہ کی منظوری حاصل کر لی جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مستعفی ہونے والا افسر خود ہی اپنے جانشین کا انتخاب کر کے تقرری کے احکام جاری کر دیتا۔

اوّل اوّل جمعہ اور عیدین کے خطبے خلفا خود دیا کرتے اور خود ہی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بعد میں جب ایرانی اور ترک حکمرانوں نے مختلف ممالک میں حکومتیں قائم کر لیں تو چونکہ وہ عربی زبان کے ماہر نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس لیے یہ خدمت بہ احسن وجوہ سر انجام دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیشِ نظر دین و دنیا میں دوئی کا تصور پیدا ہو گیا۔ دنیا بادشاہوں نے خود سنبھال لی۔ اور احکام دین کی سربراہی خطیبوں اور اماموں کے سپرد کر دی گئی۔ بادشاہ محلوں میں بند ہو گئے اور علما خانقاہوں اور مساجد میں۔ بادشاہوں کا انہماک کاروبارِ دنیا میں اتنا بڑھا کہ احکام دین سراسر فراموش ہو گئے۔ عوام سے ان کا ربط ضبط گھٹتے گھٹتے صفر کے درجے تک پہنچ گیا اور علما اور خطیبوں کی بن آئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ملائیت کی بنیاد رکھی گئی۔ بادشاہوں کی دین سے بیزاری اور رعایا سے دوری بڑھتی گئی اور علما کا رسوخ ترقی کرتا گیا۔ چنانچہ وہ وقت بھی آ گیا کہ دین و دنیا کے نمایندوں میں رقابت پیدا ہوئی اور وہ ایک دوسرے کے ممد و معاون ہونے کے بجائے رقیب و معاند بن گئے۔ مولانا جلال الدین رومی کے والد مولانا بہاء الدین سے سلطان وقت صرف اس لیے ناخوش تھا کہ مولانا اپنے تقدس اور تقویٰ کی وجہ سے حد درجہ مرجع خواص و عوام تھے۔ ایک دفعہ سلطان مولانا کی زیارت کو گیا۔ وہاں ہجوم خلق کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑا۔ اور مقام حیف ہے کہ مولانا کی یہی مقبولیت ان کی جلاوطنی کا باعث ہوئی۔

چھوٹے موٹے قصبوں کی انتظامی ذمہ داری جس شخص کے سپرد ہوتی، اسے رئیس کہتے تھے۔ یہ منصب بھی موروثی شمار ہوتا۔ عوام میں امن و امان قائم رکھنا، ان کے جھگڑے چکانا اور جائز شکایات کا ازالہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ نیز اپنے علاقے کے لوگوں کی حاجات کو حکامِ اعلیٰ تک پہنچانا اور ان کی تکالیف کا ازالہ کرانا بھی اسی کا کام تھا۔ اسی طرح شاہی احکام کی تعمیل کرانا اور وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے فرامین کو رعایا تک پہنچانے کا ذریعہ بھی یہی شخص ہوتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کی اکثریت خوش حالی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس لیے وہ شورو شر کو حد درجہ ناپسند کرتے تھے۔ حکومت کا رویہ بھی عموماً ہمدردانہ ہوتا، اور کسی شخص کو بلاوجہ بہت کم پریشان کیا جاتا۔ کسان اپنی موروثی زمینوں میں ہل چلایا کرتے، فصلیں اگاتے اور خوشی سے سرکاری مالیہ ادا کرتے۔ جو کسی حالت میں بھی تمام پیداوار کے چوتھے یا پانچویں حصے سے زیادہ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی غیر معمولی حالات میں سال یا دو سال کی مالگزاری پیشگی بھی وصول کر لی جاتی۔ مثلاً جب چنگیز خاں سمرقند پر حملہ آور ہوا تو سلطان علاء الدین مزید فوج بھرتی کرنے کے بہانے خراسان کو چل دیا۔ اور وہاں کی رعایا سے دو سال کا مالیہ تازہ فوج کو مسلح کرنے کے بہانے سے پیشگی وصول کر لیا۔ بعد میں جب مغلوں نے اس علاقے کو فتح کر لیا تو انھوں نے بھی دو سال کے پیشگی مالیہ کا مطالبہ کیا۔ جو رعایا کو پورا کرنا پڑا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوارزم شاہی عہد میں رعایا کی حالت مقابلتاً بہتر تھی۔ جب بخارا فتح ہوا اور چنگیز خاں اپنی وحشی اور غیر مہذب افواج کو ساتھ لیے شہر میں داخل ہوا۔ اور اس نے زندگی میں پہلی دفعہ عالی شان محلات عظیم الشان مساجد، جلیل القدر مدرسے، پُر رونق بازار اور منڈیاں دیکھیں اور اپنی قوم کی خانہ بدوشانہ زندگی پر نظر ڈالی تو وہ بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ اور شہر کے نمایندوں سے عوام کے جان و مال کے جو وعدے کیے تھے سب بھول گیا اور حکم دیا کہ اہالیانِ شہر کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا جائے۔ اس ایک ظالمانہ حکم سے چھ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اس قتلِ عام کے بعد ہر شہر کے باشندوں کو قتل کرنے کے بعد شہر کو لوٹنا مغلوں کا معمول بن گیا۔ چنانچہ مال و دولت کی چمک دمک سے ان کی کایا پلٹ ہو گئی اور وہ اتنے لالچی ہو گئے کہ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی چیر پھاڑ شروع کر دیتے تھے۔ کیونکہ انھیں کسی نے کہہ دیا تھا کہ بعض لوگ قیمتی اشیا نگل بیٹھتے ہیں۔

آمدنی کے ذرائع میں مالِ غنیمت کا نمبر پہلا تھا۔ قرآنی احکام کی رو سے غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں داخل کر دیا جاتا۔ اور چونکہ اس زمانے میں جنگوں پر کوئی خاص پابندی نہ تھی، اس لیے جس طرح آمدنی ہوتی تھی، اسی طرح اخراجات بھی بڑھتے گھٹتے رہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آمدنی کی دوسری اہم مد زمینوں کا آبیانہ اور مالیہ تھا، جو ہر فصل تیار ہو جانے کے بعد سرکاری کارندے نقد یا جنس کی صورت میں وصول کیا کرتے۔ مالیے کی شرح کل پیداوار کا چوتھا یا پانچواں حصہ ہوتا تھا۔ اسی طرح مال کی درآمد اور برآمد پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا اور چونکہ اس زمانے کی تجارت عہد حاضر کی پابندیوں سے آزاد تھی اور تجارتی قافلے مختلف ممالک کا سامان تجارت لیے بلا خوف و خطر گھومتے پھرتے تھے، اس لیے اس مد میں بھی کافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ آمدنی کی چوتھی مد وہ خراج تھا، جو مختلف ریاستیں حکمران اعلیٰ کو ادا کرتی تھیں۔ ان باجگذار ریاستوں کی تعداد حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ خراج کی رقم اکثر غیر معمولی ہوا کرتی تھی۔

بلاشبہ ان مدات سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی، اس میں سے کچھ حصہ بڑے بڑے شہروں بالخصوص حکومت کے صدر مقام کی تزئین پر بھی ضرور صرف ہوتا ہوگا۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت حموی لکھتا ہے کہ میں نے خوارزم سے زیادہ پر عظمت، خوبصورت اور امیر شہر اور کہیں نہیں دیکھا جب سلطان محمد کا زمانہ عروج تھا۔ اس وقت کوئی اور اسلامی سلطنت بشمول خلافت بغداد شان و شوکت میں خوارزم حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

عام طور پر شہروں کی حالت نہایت اچھی تھی۔ ان کے اردگرد مضبوط فصیل کھینچ دی جاتی، جو مضبوط پتھروں سے تعمیر کی جاتی تھی۔ بعض سرحدی شہر ایسے بھی تھے جن کے اردگرد ایک سے زیادہ فصیلیں بھی موجود تھیں۔ قلعے شہروں کی حفاظت کا بہت بڑا اور عمدہ ذریعہ تھے۔ اس لیے تقریباً ہر شہر کے وسط میں مضبوط قلعہ ہوتا جو محصورین کی آخری پناہ گاہ سمجھا جاتا تھا۔ بازاروں اور سڑکوں کی حالت عموماً اچھی ہوتی، سڑکوں کو پختہ کرنے اور بازاروں اور گلیوں میں پتھروں کی سلیں لگانے کا انتظام بھی تھا۔ اسی طرح ہوٹلوں، کارخانوں، سکولوں، کالجوں، کاروان سراؤں، عمومی لائبریریوں اور خانقاہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ شہروں اور قصبوں کے اردگرد نہایت عمدہ باغات لگائے جاتے۔ شہر بڑے بارونق اور آباد ہوتے تھے بلکہ بعض شہروں میں انسانوں کا بے پناہ ہجوم بھی پایا جاتا، جو دیہات کو چھوڑ کر یا سرحدی مقامات سے بھاگ کر نسبتاً محفوظ مقامات میں آباد ہو جاتے۔ نیز عوام کی مالی حالت تسلی بخش تھی اور وہ اس زمانے کے معیار کے مطابق خوشحال شمار ہوتے تھے۔

ماخذ: ۱- انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ۲- سیاست نامہ (نظام الملک طوسی)
۳- معجم البلدان (یاقوت حموی)۔ ۴- السیرۃ جلال الدین (احمد النسوی) ۵- ترکستان۔ ڈبلیو بارتھولڈ

© rasailojaraid.com